

انہو کے سرد

پیشی ناول

شاہک زبان بیانیہ
زیر انور غالب



چینی ناول

ادھوے سرد

ژانگ زیان لیانگ
ترجمہ: انور غالب



آر۔ بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کپلیکس
عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ 54600، پاکستان

مصنف کا پیش لفظ

چین ایک عجب پر سرار ملک ہے۔ اسے سمجھنا اور جاننا آسان نہیں۔ یہ غیر ملکوں کے لئے بھی معمہ ہے، اور خود چینوں کے لئے بھی ایک پہلی۔ اس کا یہی اچھوتا پن اور پر سرار ہونا ہی اس کی خوبصورتی اور جادو ہے۔ اس کتاب میں اس معمے اور پہلی کو حل کرنے کے لئے کچھ اشاروں کنایوں میں باتیں کی گئی ہیں۔ امید ہے پڑھنے والے نتائج خود اخذ کریں گے۔

زانگ ایکسن لیانگ

نومبر 1986

ادھورے مرد

مصنف: زانگ شیانگ لیانگ

اردو ترجمہ: سزانور غالب

کاپی رائٹ (c) انگریزی - مارٹھا یوری 1986
کاپی رائٹ (c) اردو - 1996 مشعل

ناشر: مشعل

آر بی 5، سیکنڈ فلور،

عوامی کپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور - 54600، پاکستان

فون و فیکس: 042-5866859

E-mail: mashal@infolink.net.pk

دیباچہ

انسانی تاریخ کی رو سے بلاشبہ چین اقوام عالم میں سب سے زیادہ قدیم ملک قرار پاتا ہے۔ چینی قوم اپنی قدیم جغرافیائی حدود میں پانچ ہزار سال پرانی تسلیم شدہ تہذیب اور تمدن کی نہ صرف حامل ہے بلکہ اس سے بخوبی آگاہ بھی ہے۔ اور فخر بھی کرتی ہے، یہ فخریہ اظہار بعض حلقوں میں اس پر تنقید کا باعث بھی بنتا ہے۔

مارکو پولو سے لیکر اب تک تمام مورخین سیاح اور ہر قسم کے علمی مبصر اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ چینی تہذیب اور تمدن بہت حد تک بیرونی اثرات سے مبرا رہے ہیں۔ چین کے مذاہب، فلسفے اور فنون، اس کا لوک ورثہ دیو مالا اور قدیم اساطیر و علامات اس کی اپنی سر زمین کی پیداوار ہیں۔ اور اس کی روایات کے تمام سرچشمے ان کی اپنی بودو باش ان کی ہی مٹی کی خوشبو اور جذبات و خیالات کی گرمی سردی سے پھوٹتے ہیں اور انسانی زندگی کو اپنے ماحول کے مطابق حسن و ذوق بخشتے ہیں دوسری قوموں اور ملکوں کی مداخلت ان کی تہذیب اور ان کے تمدن پر بہت کم اثر انداز ہوئی ہے۔ اس بات کا بین ثبوت خود چینی زبان، اس کا رسم الخط اور ان کی ادبی روایت کا بتدریج پھیلاؤ ہے۔ جو دیگر تمام اقوام سے خاصا مختلف اور منفرد ہے۔

یہاں بہر حال دو بیرونی تاریخی عوامل کا ذکر کر دینا ضروری ہو گا۔ ایک تو برصغیر پاک و ہند سے بدھ مت کا تبت اور چین کی طرف ہجرت پذیر ہونا اور دوسرا بیسویں صدی کے اوائل میں جدلیاتی فلسفے اور مارکسی فکر کا چین میں موثر ورود۔ ان دو عوامل نے چین کی تاریخ پر کچھ نہ کچھ اثرات ضرور مرتب کئے ہیں۔ زیر نظر ناول ”ادھورے مرد“ میں بھی آپ کو ان عوامل کی اثر پذیری جا بجا نظر آئے گی۔ جدید چین فکر کے جن اندیشوں میں الجھا ہوا ہے اس کی جھلک اس کتاب میں خوبصورت انداز سے دکھائی گئی ہے۔

1949 میں چینی کمیونسٹ انقلاب کی حیرت انگیز کامیابی کے بعد چین میں جو

نسل جوان ہوئی اسی نسل کے ایک معتبر نمائندہ زانگ شیانگ لیاٹنگ ہیں۔ یہ بنیادی طور پر شاعر اور ادیب ہیں۔ 1936 میں نین جنگ میں پیدا ہوئے۔ چین کے شمال مغربی صوبے ننگسیا میں ہائی سکول تک کی تعلیم حاصل کی۔ پھر 19 سال کی عمر میں کیونسٹ پارٹی کے قائم کردہ ایک تعلیم ادارے میں استاد بھرتی ہو گئے۔ اسی دوران شاعری میں شہرت حاصل کی اور قومی سطح پر پہچانے جانے لگے۔ اور یہ شاعری ان کی تمام مشکلات کا باعث بنی۔ 1956 میں جب چیرمین ماؤ نے اپنی مشہور زمانہ تحریک 100 پھولوں (Hundred Flowers Movement) کا جراء کیا۔ تو یہ شاعر بھی زیر دام آگیا۔ اب تو کہا بھی یہ جاتا ہے کہ اس 100 پھولوں کی تحریک کا مقصد ہی چھپے ہوئے دانشوروں کو ان کے بلوں سے سانپوں کی طرح باہر نکال کر تلف کرنا تھا۔ زانگ بھی معاندانہ شاعری کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے۔ اور پھر ان کی صعوبتوں کا زمانہ 20 سال پر پھیلتا چلا گیا۔ 1956 سے لیکر 1976 تک یا تو وہ قید رہے یا پھر مختلف مشقتی کیمپوں میں اذیت ناک تربیتی مراحل سے وہ دو چار ہوتے رہے۔ کبھی کھیتوں اور کھلیانوں میں مشقتی مزدور کی صورت میں یا پھر بھیڑ بکموں کا چرواہا بن کر اور کبھی گھوڑے پالنے کی مہارت حاصل کرتے ہوئے، اسی طرح کے مشاغل میں اس نوجوان شاعر کو مصروف اور معتبور رکھا گیا۔

زیر نظر ناول ”ادھورے آدمی“ اس دور کی ادبی پیدوار ہے زانگ نہایت چابک دستی سے اپنے شاعرانہ فن اور حیات سے کام لیا ہے۔ اس ناول کی ساخت اسکی زبان میں شعری نثر اور شاعرانہ شعور کا کفنی عمل دخل ہے۔ مصنف نہایت موزوں اور موثر انداز میں ناول کی بنت میں سیاست، لوک ورثہ، مذہبی اساطیر، ادبی علامات اور عالمگیر ادب کے حوالے اور موجودہ صورت حال کو ”خوبصورت موزیک“ کی مختلف اشکال میں پیش کیا ہے۔ کہیں بھی اپنی ذاتی رائے اور تنقید کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ کرداروں کی تشکیل میں بھی ”شاعرانہ عدل“ سے ہی کام لیا ہے۔ بے شک جذبات کی شدت بھی ہے اور اظہار کی جدت بھی ہے۔ لیکن کردار سازی میں چاہے وہ ”ایلیٹ گھوڑے“ کا ہو یا اس کی کشتی گفتگو اور ہم کلامی کا ذکر ہو اور چاہے وہ ”کارل مارکس“

کا ہو جس خوبصورتی، توازن اور حسن سے اس نے ان کرداروں میں اپنے ناول میں جان ڈالی ہے داد دئے بغیر رہا نہیں جاسکتا زانگ نے نہایت مہارت اور فنی قابلیت سے اپنی ”آپ بیتی“ کو ”جنگ بیتی“ بنا کر پیش کیا ہے۔ اور یہی اس ناول کا دراصل کارنامہ ہے۔

چین کی عظیم روحانی پیشوا اور مفکر کنفیوشس نے اپنے تاریخ ساز نقطہ نظر اور تمثیلات کی کتاب ”مجموعے“ (Analactics) میں کہا ہے کہ معاشرے کے تخلیقی فرد کا کام دراصل ایک مقدس برتن کے ظرف میں ڈھل جانا ہی ہوتا ہے۔ وہ ”مقدس برتن“ (Sacred utencil) کی مانند ہوتا ہے۔ جس میں زمین کا عطر اور اوپر سے نازل ہونے والا مقطر پانی بوند بوند جمع ہو کر لبالب بھر جاتے ہیں۔ یہی اس فرد کی زندگی کا تمام حاصل ہے۔ اس بات کا اظہار امریکی شاعر ایڈرا پائڈ نے کنفیوشس کو داد دیتے ہوئے اپنی کسی کتاب میں کیا تھا۔

اس ناول کی بھی یہی خوبی ہے۔ یہ اپنے عہد کی نمائندگی کرنے والا وہ برتن بھی ہے اور ”جام سفال“ بھی جس میں ظاہر و باطن کی اچھی بری، نیک و بد تمام قاتل ذکر ”حقیقتوں“ کا ذکر آگیا ہے۔ جن سے آج کا چین دوچار ہے۔ ان کا نچوڑ، نھرا ہوا صاف شفاف عکس اسی برتن میں ضرور نظر آتا ہے۔

آج سے تقریباً ساٹھ ستر سال پہلے جب ڈی ایچ لارنس نے ادبی تنقید کے میدان میں بھی اپنی تخلیقی طبع آزمائی کا آغاز کیا تھا تو اس نے ناول کی صنف کے بارے میں بھی کئی خوبصورت اور گراں قدر تنقیدی حوالے عالمی ادب کے لئے بطور ورثہ عطا کئے تھے، ناول کے مستقبل کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس نے اپنی کتاب ”لاشعور کے جہان عجائب“ (Fantasia of the unconscious) میں کہا تھا کہ مستقبل کا ناول اپنی ہیئت کو یکسر بدل دے گا۔ کہانی اور داستان کی اپنی جگہ ہے۔ لیکن ناول میں مصنف کا نظریہ حیات۔ فلسفہ مذہب، سائنسی فکر اور عالمی اساطیر و علامات کے مواخذ تمام ایک شدت کے ساتھ اثر انداز ہونگے۔ اور ناول کو ہمیں نئی ادبی اقدار اور ایک نئی نفسیات کے حوالے سے دیکھنا اور سمجھنا پڑے گا۔ بے شک یہی کچھ لارنس نے خود

اپنے ناولوں میں کیا اور یہی کچھ اوروں سے بھی چاہا۔

چینی ناول نگار کا یہ ناول ”ادھورے آدمی“ بہت حد تک اسی پیش گوئی کی صداقت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں لارنس کے گنوائے ہوئے تمام عوامل نظر آتے ہیں۔ چین کا ماضی، حال اور کسی قدر مستقبل اس ناول کے جدید اور قدیم کرداروں، اس کی علامتوں اور اساطیر میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ ناول ایک ایسا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ جس میں چین کا جدید انسان، عالمی انسانی وجود کا پر تو نظر آتا ہے۔

ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ اس ناول پر لارنس کے وہی اعتراض بھی وارد ہوتے ہوں۔ جن کی وجہ سے لارنس نے ”عظیم روسی ناول نگاروں مثلاً“ ٹالسٹائی، دستوویسکی اور چیخوف کی کافی حد تک عیب جوئی کی تھی۔ دراصل لارنس کے ہاں جس ”عالمی ہیرو“ اور مرد خود آگاہ کی تلاش نظر آتی ہے جو ”تہذیب نسواں“ اور ”ترغیب نسواں“ کا کام بھی بخوبی سر انجام دے سکے۔ وہ ان روسی ناول نگاروں کے ہاں تقریباً مفقود ہی نظر آتا ہے۔ زانگ نے نفسانی جذباتوں اور جنسی انحطاط کا تجزیہ تو جبر اور تشدد کے حوالے سے کیا ہے، لیکن اسکا ہیرو عالمی سطح کا ہرگز نہیں۔ اس کے ہاں تو یہ نظر آتا ہے کہ جبر اور تشدد کے تحت جو فلسفہ نافذ کیا جائے چاہے وہ جدلیاتی ہو یا کوئی اور وہ نفس کو مجروح کرتا ہے۔ اور ”مردانہ پن“ کو فروغ دینے کے بجائے ہیروؤں کے کلچر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جس میں انسان کی بچے کچی توانائیاں بھی رو بہ زوال ہونے لگتی ہیں۔

اس ناول میں باطنی سطح پر کہیں یہ اور اک ضرور موجود ہے کہ انسان کی تعمیر میں عورت اور مرد کا حصہ برابر ہے۔ انسان کا ایک نصف یقیناً عورت ہے، اور دوسرا نصف مرد۔ دونوں کے بغیر وہ ہرگز تخلیقی سطح پر مکمل نہیں ہو پائے گا۔ ہیرو کی تلاش میں مردوں کی ہمسائیگی میں عورتوں کو بھی اپنا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ عورت سے مرد بھاگ نہیں سکتا۔ کیونکہ اب ع

”فرصت شوق بن گئی دیوار
اب کہیں بھاگنے کا رستہ نہیں“
ناصر کاظمی

انسانی معاشرہ اپنی بشارتیں حاصل نہیں کر سکتا، جب تک ”عورت“ اس کے اعصاب پر سوار نہ ہو۔ اس کے بغیر جدلیاتی فلسفے کے بند گلی ہو یا مغربی جمہوریت کی کھلی مارکیٹ۔ احترام عورت کے بغیر تمام امیدیں نامرد اور نامراد ہی رہیں گی۔

مترجم کی حیثیت میں بارہا یہ خیال گزرا کہ زانگ کا یہ ناول روسی ناول نگار بورس پاسترناک کے ناول ”ڈاکٹر ژواگو“ سے کئی ”مشابہتیں“ رکھتا ہے۔ روسی انقلاب کے بعد کا زمانہ جس طرح پاسترناک کا موضوع تصنیف رہا۔ یہی حال اس ناول کا ہے۔ یہ ماؤ کے ”ثقافتی انقلاب“ پر خوبصورت تنقید ہے۔ شاید اس ناول کو عظیم تو نہ کہا جا سکے لیکن یہ اس دور کا ایک اہم ناول ضرور قرار پائے گا۔

آخر میں مترجم کے ناطے اتنا ضرور کہوں گی کہ ترجمہ چاہے کوئی بھی کرے کسی نہ کسی طرح ناقص ضرور ہوتا ہے۔ صحیح ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ مترجم دراصل کئی اعتبار سے ”ترجمانی“ کا کام ہی سر انجام دیتا ہے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ جس انگریزی ترجمے سے میں نے استفادہ کیا وہ مارٹھا ایوری (Marht Avery) کا تھا۔ مارٹھا کی شاید عورت ہونے کے ناطے سے اس ناول کی جڑوں پر خاصی مضبوط گرفت تھی جس نے میرا کام خاصاً آسان کر دیا۔ ناول کے ظاہر و باطن تک پہنچے میں مارٹھا کے ترجمے کی وجہ سے دشواری پیش نہیں آئی۔ ترجمہ تو کر دیا لیکن جب ایک نظر غور سے خود دیکھا تو یہی محسوس ہوا کہ ”حق تو یہ ہے ہے کہ حق ادا نہ ہوا“۔

انور غالب

”حصہ اول“

MashalBooks.Org

1

ہو سکتا ہے میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہو مگر وہ مجھے یاد نہ تھی۔ ہو سکتا ہے میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو لیکن اس بار تو وہ اپنے انٹ نفوش چھوڑ گئی۔ دو ماہ پہلے مجھے ڈاؤن قصبے سے تبدیل کر کے یہاں دھان کے کھیتوں میں قید با مشقت پانے والوں پر بطور نگران بھیجا گیا تھا۔ ڈاؤن میں بھی میرا یہی کام تھا۔ میں خود ایک قیدی تھا۔ لیکن ایک خاصے بڑے ٹولے کی نگرانی کرتا تھا۔ جو قیدیوں کی ایک بڑی بریگیڈ کا حصہ تھا۔ ان سب کو مشقت اور محنت کے ذریعے سدھارنے اور تربیت دینے کا کام، اور اب یہی کام میں یہاں دھان کے کھیتوں پر ان مشقتی قیدیوں کی اس چھوٹی سی ٹکڑی کے نگران کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔

جس شخص نے مجھے یہاں تبدیل کرنے کی درخواست کی تھی یہ وانگ ہی تھا۔ یہاں کی ”مقامی تنظیم“ کارکن اور یہاں کے گروہ کا سرغنہ، زمیندار خاندان کا یہ چھوٹے قد والا بوڑھا سا آدمی، وانگ نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہوا سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا ”کیا تم ہو نگران؟ تم پر حکام بلانے اعتماد کیا ہے بیڑا غرق، ان بارہ آدمیوں کو قابو میں رکھنا بہت دشوار ہے، مصیبت ہی مصیبت۔ تم ان بارہ کو اگر سنبھال لو، تو بس سمجھ لو کہ تم باہر جا کر اٹھارہ سو مزدوروں والی فیکٹری بخوبی چلا سکتے ہے“

وہ نہر کے اوپر والے کنارے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا آرام کر رہا تھا۔ میں ایک دھان کے کھیت کو سیراب کرنے والی پانی کی ٹل کے دہانے سے گزر کر اس کی طرف پہنچ پایا تھا۔ میں اپنی تنگی ٹانگیں لیے اس کے سامنے کھڑا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے کہا کچھ نہیں بس خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ اس کا سوکھا، دھلا پتلا چہرہ جس پر جھریوں نے نقش و نگار بنا رکھے تھے۔ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ سوچ کیا رہا تھا، لیکن سوچنے کے اس انداز سے میں بخوبی واقف تھا۔ یہ یقینی طور پر کسی قیدی کو کوئی خاص کام سونپے جانے کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ گہری سوچ کا مطلب ہے گہری سنجیدگی جو غماز ہے اس

بات کی کہ اس نے کام کی اہمیت کے مطابق خوب سوچ بچار سے کام لیا ہے۔ اور پھر یہ خاموشی اس کے اور آپ کے درمیان موجود قدرو منزلت کا فاصلہ بھی واضح کرتی ہے۔ اس خاموشی سے یہ بھی اشارہ مل سکتا تھا کہ آپ کے بارے میں جو حتمی فیصلہ ہو چکا ہے اور جس میں اوپر والے افسروں اور سب کی اجتماعی سوچ اور دانش بھی شامل ہے اس کو بھی تبدیل کرنے کا اس نے ارادہ کر لیا ہے۔ یہ بات اس کا واضح اظہار تھا کہ آپ کو کوئی نئی ذمہ داری سونپنے کے ساتھ آپ پر زیادہ اعتماد کیا جانے والا ہے، نئے بھروسے کی ابتداء۔ وہ تنظیمی کارکن جو ان پڑھ ہوتے ہیں اور انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات آپ کے سامنے موثر رنگ میں پیش نہیں کر سکیں گے۔ وہ اس سنجیدہ خاموشی کے بہروپ سے خوب کام لیتے ہیں۔ اس سے ان کے رعب اور دبدبے میں اضافہ ہوتا ہے، وہ لفظوں کو استعمال میں لائے بغیر آپ پر مزید ذمہ داری کا بوجھ اچھے طریقے سے ڈال سکتے ہیں۔

محنت اور مشقت سے دوسروں کی تربیت کرنا کوئی معمولی بات نہیں یہ تو بہت اہم اور سنجیدہ اصلاحی کام ہے۔ کوئی نیا کام یا ذمہ داری سونپنا آپ کی کلیا پلٹ سکتا ہے۔ آپ کی خدمات کو انعام و اکرام سے نوازا جا سکتا ہے، آپ کی جلد رہائی کے راستے ہموار ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کا انٹرویو تو آپ کی تقدیر بدل سکتا ہے، آپ کو زندگی کے نئے موڑ پر لا سکتا ہے۔

وانگ کی خاموشی کے روپ میں اس کی نیت کی اچھائی ضرور پنہاں تھی۔ وہ سر کے کنارے جھکا سگریٹ پی رہا تھا۔ اور میں نیچے اس کے سامنے کھڑا تھا کبھی اس ٹانگ کو اور کبھی دوسری کو بدلتا، کبھی ایک پاؤں سے دوسرے ننگے پاؤں کو رگڑتا۔

جب چاول بوئے گئے تھے تو یہ مجھ پر اب گھیرے ہوئے تھے۔ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اب یہ جسموں کی شکل میں حملہ آور ہو رہے تھے۔ گھوں گھوں کرتے ہوئے، کالتے ہوئے۔ لگاتار پریشان کر رہے تھے۔ کمال باریکی سے کبھی کانوں میں، کبھی آنکھوں کے پوٹوں میں اور کبھی بغلوں میں گھس کر کالتے تھے، اور اس طرح کالتے کہ بڑے بڑے چھالے ابھر آتے۔ حیرت ہوتی تھی کہ اتنے بڑے بڑے چھالے

اور وہ بھی ان باریک چیزوں کے سبب۔ بہر حال میں کبھی اپنے پاؤں کھجلاتا، کبھی ادھر ادھر اپنے بازو لہراتا اس کے سامنے ایک طرح سے تلج رہا تھا۔ اور اس کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔

اس نے ایک لفظ بھی نہ بولا سگریٹ کے دھوئیں اور اس کی ٹوپی نے اسے کافی محفوظ کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ وہاں سے جانے کے لئے مجھ جتنا بے تاب نہیں تھا۔ قیدیوں کی بڑی بریگیڈ پہلے ہی کلنی دور جا چکی تھی، وہ سر کے کنارے مارچ کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ شام کا سورج ان کی سیاہ رویوں کی کالک دھو رہا تھا۔ وہ بید کے درختوں والے موڑ کے قریب پہنچ رہے تھے، پیچھے سے یوں دکھائی دیتا تھا کہ وہ جسم کی آلائشوں سے پاک ہو کر ایک روحانی وجود میں تحلیل ہوتے جا رہے ہیں۔

سر کا یہ موڑ ایک گاؤں کے قریب سے گزرتا تھا، جس میں کئی مقامی قیدیوں کے گھر بار تھے وہاں ان کے اہل و عیال رہتے تھے۔ میرا معاملہ بالکل برعکس تھا، میں اکیلا تھا، نہ کوئی گھر بار نہ اہل و عیال، میرا خاندان تو یہ مشقتی قیدی ہی تھے۔ اور میرا دنیا میں کون تھا، سوائے ان افراد کے جو اس مشقتی بریگیڈ کا ایک حصہ تھے۔ میری ذاتی شناخت کا مسئلہ اس طرح بھی فوراً طے پا گیا۔ کہ ایک مانوسی ہلکے سریلے نغمے کی دھن دھن کے تازہ بوئے ہوئے کھیتوں سے لہراتی ہوئی ادھر ہماری طرف آنے لگی۔

”سدھار سدھار سدھار اور سدھار کا ہر سو چرچا! واہ!“

”شام کو گھر لوٹا گھر نئے جہا بھات کالیں اک کڑچھا! واہ!“

اس وقت جو حیثیت میری وانگ کے سامنے تھی اس کے باوجود میں اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا۔ یہ گانا ہمارے سدھار کا دراصل ترانہ تھا، یہ ہمارے مشقتی گینگ کا بنایا ہوا تھا، ہماری زندگی میں روزانہ دہرایا جاتا تھا۔ ہم اسے ایک ہلکے پھلکے عمومی گیت کے انداز میں گاتے تھے، جو ننگی سیسائی زبان میں تھا۔ الفاظ ہمارے خود ساختہ تھے اور مقامی بولی سے لئے ہوئے تھے۔ ہر شہری بولی میں کے مقامی لوگوں کے لئے بدیسی زبان جیسی تھی، اصلی دھن کے بول کچھ اس طرح سے تھے۔ ”مردہ بلو بلورچی خانہ، مردہ بلو بلورچی خانہ، مردہ بلو بلورچی خانہ۔“

ہمارا نغمہ ”شام کو گھروٹو اور گھر میں ہے بھات کابس اک کڑچھا“ ہمارے لئے ایک طرح سے رغبت کا پیغام بھی ہوتا تھا۔ کیونکہ اس میں آکسہٹ ہوتی تھی، اس بھات سے بھرے ہوئے ایک کڑچھے کے لئے جس پر کترے ہوئے سبز پیاز کو فراخ دلی سے چھڑکا ہوتا تھا۔ خانسے، باورچی خانے میں اپنے بچے تلے انداز سے بڑے بڑے چاولوں والے کڑھاؤ میں جن سے خوب بھاپ اٹھ رہی ہوتی تھی، ایک ہی تھپ اور سرتل میں اپنے بڑے بڑے کفگیر چلا رہے ہوتے تھے۔ ان کے کھورے بازوں کے پٹھے زور زور سے ہلتے تھے، اور اس طرح ان کے جسم سے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ، کڑھاؤ میں گرتے جاتے تھے۔ اس طرح میلے کچیلے جسموں کی بدبودار بوندوں کی آمیزش سے ہمارے رات کے کھانے میں انسانی جسم کی گھلی ملی چٹنی کا مزا اور مہک بھی شامل ہو جاتی تھی۔

میں بھی واپس اسی بڑے ٹولے میں شامل ہو جانا چاہتا تھا جہاں محنت اور کام کا رنگ ڈھنگ مشینی انداز کا تھا۔ اور پھر سب سے زیادہ اس کا سبب ”بھات کابس اک بڑا کڑچھا“ والا نغمہ اور اس کے ساتھ بھوکے پیٹ کی ہم آہنگ آواز اور چاہت کا احساس تھا۔ گینگ لیڈر وانگ خاموش تھا، اس کے ساتھ میرا خاموش رہنا بھی لازم تھا۔ میں دو مرتبہ پہلے بھی قید با مشقت کٹ چکا تھا۔ مجھے ان کیمپوں کے قوانین سے مکمل آگاہی تھی۔ انہی ان لکھے قوانین کی جان کاری کی وجہ سے مجھے اپنی تیسری قید با مشقت کی دوران یہ اعزاز ملا تھا کہ چار پورے ڈویژنوں کے قیدیوں کی نگرانی میرے ذمہ تھی۔ یعنی اس بریگیڈ کے 64 افراد کی ذمہ داری۔

باہر تو یہ عالم ہے کہ اگر کسی شخص کے سیاسی رجحانات ذرا بھی مشکوک نظر آتے ہوں تو اس سے دور ہی رہا جاتا ہے، وہ سوسائٹی میں ایک طرح سے اچھوت ہو جاتا ہے، جس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برعکس جو لوگ کسی اخلاقی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کو محض بد قسمت سمجھا جاتا ہے۔ ان کی دشواری اور مصیبت ان کے اپنی جذباتی اور ”اور اندورنی تضادات“ ہوتے ہیں، جن کی وہ سزا بھگت رہے ہوتے ہیں، لیکن یہاں اندر صورت حل مختلف ہوتی ہے۔ قید با مشقت کے دوران

یہاں کے نظریات، قدریں، اور خیالات اور سوچنے کا انداز بالکل الگ ہوتا ہے۔ باقی چین سے بالکل مختلف اور مزاحمت آمیز۔

قید با مشقت کے دوران جو فراست حاصل ہوتی ہے اور جو وجدانی انکشاف ہوتے ہیں، ان کے اپنے فائدے اور انعام ہیں۔ مشقتی ٹولے کے اندر وہ سیاسی قیدی جس پر اعتماد کیا جاسکے اس کا رتبہ اور مقام عام اخلاقی مجرموں اور سزایافتوں سے بالکل علیحدہ اور ممتاز ہوتا ہے، اس سے الگ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ مشقتی کیمپ ایک طرح سے آزاد خود مختار ریاست کی طرح ہوتا ہے، ایک الگ بادشاہت۔ اس میں زندگی کے تمام ضروری پیشے اور فنون ہوتے ہیں، اسی لئے یہاں ایک دینی فریضے کے طور پر یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ہر کوئی کسی نہ کسی ہنر اور مہارت کو پوری تہدی اور جانفشانی سے مکمل طور پر سیکھنے اور اپنانے کی کوشش کرے۔ جس میں کوئی قابلیت یا ہنر ہو گا، وہ ضرور اسے مل کر رہے گا اس کو وہ کام ضرور سونپا جائے گا۔ مثلاً ایک ڈاکٹر بے شک بعض وجوہات کی بنا پر باہر بیت الخلا، صاف کرنے پر مامور کر دیا گیا ہو۔ لیکن مشقتی کیمپ میں اگر وہ آگیا ہے تو ضرور ڈاکٹری کے فرائض پر ہی تعینات کیا جائے گا۔ آپ اسے جلد ہی تمام مریضوں کا علاج کرتے دیکھ لیں گے۔ اس لحاظ سے قید با مشقت کے کیمپ باہر کے حالات کے مقابلہ میں زیادہ معقول رویہ اپناتے ہیں۔ اور ان کا برتاؤ بہتر ہوتا ہے۔

وانگ کے سامنے میں نہایت مضحکہ خیز انداز میں کھڑا تھا کہ میرے دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھ متواتر پھروں کی وجہ سے حرکت میں تھے۔ گویا میں تربیت کے لحاظ سے بھی عمومی ڈسپلن کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ پھر بھی گینگ لیڈر وانگ نے میری سرزنش نہیں کی درگزر سے ہی کام لیا، وہ سگریٹ پیتا رہا۔ ہم دونوں کو اس بات کا لاشعوری طور پر احساس تھا کہ میری اطاعت کی بنیاد اور نوعیت قدرے مختلف ہے جبکہ اسکی اپنی ایک اہمیت ہے۔ عین ممکن تھا کہ وانگ اس خاموشی کو توڑتے ہوئے مجھے باہر سے آنے والی کوئی خاص خبر اچانک سنا دے۔ یہ خشک سا فحشج کارکن اپنی سیاسی وابستگی کے باوجود دل کا اچھا انسان تھا۔ اس کی ساری عمر اس چین کی زرد مٹی کی بو باس میں

گزری تھی۔ وہ اس دیس کی بلندیوں اور پستیوں سے اچھی طرح مانوس تھا۔ وہ اس زمین کا سیدھا سا انسان تھا۔ گندگی کے ڈھیر کی طرح ظاہر اور باہر کوئی ہیر پھیر نہیں تھا۔

سیکڑوں سالوں سے وہی پرانی کاشتکاری اور زراعت کے طریقے اور سلیقے۔ ان کی وجہ سے اخلاقی اقدار اور روایتیں بھی قدیم اور دیرپا تھیں، اور ان میں ایک ٹھہراؤ اور ثبات تھا۔ اس دور کی یہ طبقاتی کشش اور مزاحمت ان جیسے لوگوں کے لئے محض ایک بکواس تھی، جو ان کی سمجھ سے بالا تھی۔

جب ہم ایک دوسرے سے فحش اور گندے مذاق کرتے تھے۔ یا پھر مشقتی سدھار کا توہین آمیز ترانہ گاتے تھے تو وانگ نے ہمیں سزا نہیں دی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اپنا ہیٹ اٹھا کر اپنی ٹنڈ کو سہلاتے ہوئے ایک طرح سے تحسین کے انداز میں اپنے خاص محاورے کا استعمال کرتا۔ ”آہا بد معاشو۔ جاؤ جنم میں بد کارو“ یہ سن کر کہ ویت نامیوں نے امریکیوں کے کئی ہوائی جہاز مار گرائے ہیں وہ فقرہ کستا۔ ”دیکھو ان بد معاشوں کو“ یہ ویت نامی جرنیلوں کی تعریف اور تکریم کے لئے اس کا تکیہ کلام تھا۔ ایک دن ہم نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اپنے ننھے سے بچے یعنی پوتے کو ہمارے پاس لایا۔ اس کو سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”کیسے ہو تم بد معاش“ ہم قیدی اس کے اس محاورے کے استعمال سے اب مانوس ہونے لگے تھے، اور ہمیں اس گلی سے اب کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

ہمارا گروپ دھان کے کھیتوں سے جنگلی بوٹیوں کو اکھاڑ پھینکنے میں مصروف تھا یہ دن موسم بہار کے تھے 1966 کا سال انہی دنوں ”ثقافتی انقلاب“ کی آمد آمد تھی۔ وانگ ساتھ والے قصبے میں گیا اور اپنی ساتھ کچھ پولیس کے مقامی لوگ بھی لے گیا۔ تاکہ انقلاب کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔ اس وفد کو باقاعدہ اس صوبائی نمائش کا دورہ بھی کرایا گیا جس کا موضوع ہی ”عظیم ثقافتی انقلاب کی فتوحات اور کامرانیوں“ تھا۔ واپسی پر وہ اپنے گھر بھی نہ گیا اور کھانا کھائے بغیر سیدھا ہمارے پاس دھان کے کھیتوں پر آگیا۔ اپنے کچلے اور سسلے ہوئے ہیٹ کو ٹانگوں پر جھاڑتے ہوئے

چلتے چلتے وہ پانی کی ٹالیاں پھلانگتے سیدھا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وانگ او جنہی بد معاش وہ تمہاری جنہی بر سرعام لٹکی ہوئی نظمیں، وہاں دیوار پر چسپاں تھیں اور وہ بھی اخروٹوں جتنے موٹے موٹے حرفوں میں لکھی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی عمر رسیدہ انگوٹھے اور بڑی انگلی کے ساتھ دائرہ بنا کر اخروٹ کا حجم بتاتے ہوئے سمجھایا کہ ہر حرف اتنا موٹا اور جلی تھا۔ اس کا یہ نقشہ بنا کر سمجھانا مجھے اچھا لگا۔ اس سے میری شاعری کے وجود کی جسمانی توانائی کا نقشہ سا ابھر کر سامنے آگیا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ”وہ“ تمہاری شاعری کے الفاظ وہاں بہت بڑے اور نمایاں تھے۔ جو ان تم واقعی شعر لکھ سکتے ہو۔“

ان دنوں دیہاتی آبادی میں عموماً یہی تاثر پایا جاتا تھا کہ جتنے بڑے اور موٹے الفاظ میں تحریر لکھی جائیگی اس کی اتنی ہی زیادہ اہمیت اور وقعت ہوگی۔ انہی دنوں یہ رواج شروع ہو رہا تھا کہ ”چھوٹی لال کتاب“ سے مقامی افسر اور کارندے چھوٹے چھوٹے فقرے دیواروں پر بڑے بڑے حروف میں لکھ کر بہت اہم تربیتی کلام سر انجام دے رہے تھے۔ اس لئے وانگ کے ذہن میں بھی میری ان نظموں کی خاصی اہمیت تھی جو میں نے 1957 کے لگ بھگ لکھی تھیں۔ کیونکہ ان کو بطور تنقید ثقافتی انقلاب کے اوائل میں دیواروں پر موٹے موٹے حروف میں آویزاں کیا گیا تھا۔

گو میری شاعری کو میرے جرم کے ثبوت کی صورت میں بطور تنقید عوام کے سامنے رکھا گیا تھا۔ لیکن وانگ کی باتیں سن کر میرے ساتھی قیدی مجھے خاص طور پر چور نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کے دلوں میں میری قدرو منزلت میں اضافہ ہوا تھا۔

پورے نو سال گزر گئے۔ جب میں نے یہ نظمیں لکھی تھیں۔ پھر بھی وہ انہیں عوامی تنقید کے لئے سڑکوں اور بازاروں میں گشت کرانے اور ذلیل کرنے کے لئے آئے۔ بے شک ”باہر“ چین اسی طرح قائم اور دائم تھا۔ اور ”اندر“ میں اپنی قید با مشقت کٹ رہا تھا ایک مجرم قیدی کی حیثیت میں۔ لیکن ان نظموں کی تشبیہ یہ بھی تو ظاہر کرتی تھی کہ میں اور میری شاعری ہم دونوں بھلائے نہیں جاسکتے۔ میں انہیں یاد ضرور تھا چین میں تو جب کوئی شخص عوامی تحریک کے دوران خاص طور پر تنقید کا نشانہ

بنایا جائے تو بس سمجھ لیجئے کہ وہ گید۔ اسے فراموش ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی بے شک اس کی ذاتی تقدیر انہی دنیا والوں کے ہاتھوں میں ہی ہوتی ہے۔ کہ جو جی میں آئے اس سے سلوک کریں۔ اس کی قوت ارادی کا اس میں کوئی خاص عمل دخل نہیں ہوتا۔

میں نے اپنی کمرسیدھی کی اور مٹھی بھر جڑی بوٹیوں کا گچھا باہر نہر کے کنارے پھینک دیا۔ دور پہاڑوں کی خاموشی گونگی اور بے تعلق چوٹیوں کی طرف دیکھا۔ پھر نیچے جھکا دھان کی بالیوں کو پرے ہٹا کر جڑی بوٹیوں کی تلاش کرنے لگا۔ گدلے پانی کی سطح کے نیچے نھری شفاف روشنی جھل مل کر رہی تھیں۔ جیسے روشنی کی لہریں محور رقص ہوں۔ تاریخ ازلی ابدی دائمی صورت میں یا پھر مسلسل تبدیلی اور تدریج کی حالت میں میری شاعری میں موجزن تھی۔ اور اسی طرح مجھ میں زندہ و تابندہ تھی۔ انسان ہونے کے ناطے ہم میں سے ہر ایک کو ایک نہ ختم ہونے والی مسلسل تبدیلی کی صورت کے باوجود ایک مرکز سکون میں مقیم ہونا پڑتا ہے، تبدیلی اور ٹھہراؤ دونوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، دوسری طرف مسلسل کوشش اور تھک و دو سے ان حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جو اسے اب درپیش ہیں یا پہلے تھے یا اسے کبھی پیش آسکتے ہیں۔

جب دوبارہ میں نے اپنی کمرسیدھی کی کہ کچھ اور بوٹیاں توڑ کو نہر کنارے پھینک دوں تو یک دم میں خوشی سے پھولا نہیں سا رہا تھا۔ مجھے اپنی بلندی اور قد و منزلت کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ کہ میں ہی اس المیے کا مرکزی کردار ہوں ”ہیرو“ تمام قیدی جو میرے آس پاس جھکے جڑی بوٹیاں اکھاڑ رہے رہے وہ یوں لگے جیسے ”گنگو تھا“ کے چور ہیں اور میں ہوں ”مسیحا“ خدا کا اکلوتا بیٹا۔ پہلے تو یک گونہ برتری کا احساس پیدا ہوا۔ پھر ہمدردی اور شفقت کا ایک بے پناہ سوتا اندر سے پھوٹ پڑا میں نے دل میں کہا ”وانگ تمہارا شکریہ کہ یہ خبر تم نے سنائی۔ ایک قیدی جو سزا کٹ رہا ہو اور بے عزت کیا گیا ہو اسی طور ہی زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے اپنی بڑائی کا احساس ہوتا رہے۔“

خزاں آنے تک دھان کی فصل کٹ چکی تھی۔ باہر تاریخ موسموں سے بھی

زیادہ تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہی تھی۔ ہم قیدی آج کل برادری کی ڈیوٹی پر لگے ہوئے تھے۔ ہم بالیوں کے چھوٹے دھوٹے کو جمع کر کے ایک گٹھا بناتے تھے۔ اور پھر ان گٹھوں کو گھاس پھوس سے ڈھک کر کھیت کی ایک جانب اکٹھا کرنے جاتے تھے۔ ان کو ایک خاصے بڑے انبار کی صورت میں اکٹھا کرتے اور رسیوں سے باندھ کر اپنے پشت والے رے کی مدد سے اس بڑے گٹھے کو اٹھا لیتے تھے۔ پیٹھ پر گٹھے کو اٹھا لینے کا عمل ایک خاص مہارت چاہتا تھا۔ آپ گٹھے کے پاس ایک خاص انداز سے دونوں ہاتھ بیٹھ جاتے ہیں، اور پھر پشت والے رے کو گٹھے کے اندر اڑس لیتے ہیں اور دونوں بازو رے اور گٹھے کے درمیان لا کر آپ ایک جھکے کے ساتھ زور سے اوپر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اس طرح یہ بڑا گٹھا آپ پر بخوبی سوار ہو جاتا ہے۔

میں اس کام کی دیکھ بھال پر مامور تھا اس لئے قیدیوں طور پر میں سب سے زیادہ بوجھ اٹھانے کا پابند تھا۔ مشق کیمپ میں آپ کی کوئی اور فضیلت نہیں ہوتی، کام میں نمایاں کارکردگی کے سوا باقی سب باتیں بے معنی ہیں۔ آپ کا حسب نسب، اعلیٰ تعلیم، پچھلا ریکارڈ اچھا یا برا، ان سب کی کوئی وقعت نہیں۔ ”مشقت کے ذریعے اصلاح اور سدھار“ کا مطلب ہی یہی ہے کہ آپ اپنے کام میں مہارت حاصل کریں۔ ہنرمند بنیں۔ اور دوسروں پر سبقت لے جائیں جب آپ دوسروں سے بہتر کارکردگی دکھائیں گے، تو آپ بہتر رویہ کے حق دار ہوں گے، اور آپ سے بہتر سلوک ہو گا۔ اور آپ کو دوسروں کی تربیت کرنے کا موقع ملے گا، ایک نگران کی حیثیت سے۔ تب آپ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ آپ پر کوئی کوڑا کرکٹ نہ پھینک سکے، بلکہ آپ چاہیں تو اسے بے عزت کر سکیں۔ غلاظت الٹی اس پر ڈال سکیں۔ اس طرح محنت سے آپ اپنے لئے بھروسہ اور اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ایک طرح سے ”آزاد قیدی“ کہلا سکتے ہیں۔ جب شام کو محنت اور مشقت کے بعد لوٹیں گے تو بیرکوں میں آپ کے لئے بھات کا ایک کڑچھا نہیں دو کڑچھے تیار ملیں گے۔

کام انسان کو تخلیق کا ہنر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسے فطری جذبے کو ابھارتا ہے جو ترقی یافتہ ثقافتوں میں مدتیں گزریں کہیں گم ہو گیا ہے یا مچلی سطحوں میں ڈوب گیا ہے۔

آپ قدیم وقتوں کی طرح جب کام اور محنت کے عمل سے بتدریج اور مسلسل گزرتے ہیں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ تخلیق کے عمل سے گذر رہے ہیں آپ تبدیل ہو رہے ہیں۔ بہتر ہو رہے ہیں زیادہ مفید اور کارگر۔ ایک مشقتی کیمپ میں جا کر دیکھ لو، بظاہر آپ برے وقتوں سے گزریں گے یوں محسوس ہو گا کہ پرانے نیم انسانی دور میں آگئے ہیں۔ لیکن مسلسل کام اور محنت کے طفیل روز بروز ترقی اور بہتری کا احساس آپ میں اب جاگ رہا ہو گا۔ جیسے آپ پیچھے رہ گئے تھے لیکن اب اپنی محنت اور ترقی سے جدید دور میں پھر سے داخل ہو رہے ہیں۔ پیچھے سے آکر آگے نکل جانے کا احساس آپ میں پیدا ہو جائیگا۔ ان لیبر کیمپوں کا یہی راز ہے رجعت قمری کے بعد ترقی اور بہتری کا احساس۔ حقیقت میں ترقی ہو یا نہ ہو

پانچ سال بیت گئے جب ایک بیماری سے شقیاب ہو کر مجھ میں پھر یہ جسمانی خواہش بیدار ہوئی تھی کہ میں محنت اور مشقت سے کام کر کے دکھاؤں اور اپنے جسمانی قواء اور طاقت کو آزماؤں۔ ایک مرتبہ میرے اور بھائی ایکسی کے درمیان جسمانی طاقت کو آزمانے کا مقابلہ ہوا تھا۔ ماینگشوا نے میری ہمت بندھائی تھی۔ بیماری کے بعد جب بیلچہ ہاتھ میں لیکر میں نے پہلی دفعہ کھیت کی مٹی اکھاڑی تھی۔ تو یہ ایک لازوال مسرت کا لمحہ تھا۔ جسے میں نے ان گنت بار دہرانے کی کوشش کی۔ اسی طرح جب چاول کاشت کئے۔ گیلی مٹی کو ہاتھ لگایا، دھان کے گٹھے اٹھائے یہ تمام عمل باعث تسکین و اطمینان تھا۔ جب ایک گیلی سی بان کی بوری کو اٹھاتے ہوئے میرے کندھے پسینے سے شرابور ہوئے اور چاولوں کے بوجھ نے میری کمر جھکا دی تو میں ایک ایسی پر مسرت کیفیت میں داخل ہو گیا کہ سب کچھ بھول گیا۔ یوں لگا کہ میں نے جلوہ کے جوتے پہن لئے ہیں اور بے انتہا گرائیوں میں چھلانگ لگانے کے قائل ہو گیا ہوں، بلکہ موت کے منہ میں کود سکتا ہوں۔

جب دھان کے گٹھے اٹھانے لگا تو ایک لالچ مجھ پر سوار ہو گیا آزما کر دیکھوں آخر میں کتنا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔ بوجھ اگر خاصا وزنی ہو تو اس کو اٹھانے سے آپ یقیناً اس ”ماوی دنیا کی ماریت“ کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ایک عام قیدی چاولوں کے دو

تین گٹھے اٹھا لیتا ہے۔ میں پانچ اٹھا کر بھی بس نہیں کرتا تھا، چھ بھی کافی نہ تھے، بلکہ سات گٹھے اٹھائے اور جب یہ بوجھ اٹھائے ہوئے میں گینگ لیڈر وانگ کے پاس سے گزرتا تھا تو وہ اپنے انداز میں داد و تحسین کے ڈوگرے برساتا۔ واہ بدمعاش تم تو فخر سے بھی زیادہ وزن اٹھا لیتے ہو۔

جانے بھی دو بھلا فخر کا مجھ سے کیا مقابلہ !
میں تو میں ہوں !
نہ اپنے آپ پہ ترس کھاتا ہوں
نہ اپنے آپ سے محبت کر پاتا ہوں
روح کی طاقت اور بڑھائی !
مقدر سے موت تک ہاتھ پائی !

میں وزن بہت اٹھاتا تھا اس لئے وانگ کبھی کبھی میری مدد کرتا تھا۔ جب میں گٹھے اکٹھے کر لیتا اور ان کو باندھ کر بڑا گٹھا بنا کر پشت پر اٹھانے لگتا تو وہ دوڑا ہوا آتا اور مجھے پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے سہارا دے دیتا۔ یہ ہلکی سی جنبش اور دھکا بہت کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ جب آپ ایک دفعہ بوجھ اٹھا کر دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں، اور ایک لمبا سانس لے لیں تو بس سمجھ لیں کہ آپ کامیاب ہو گئے جس طرح ایک ویٹ لفٹر بہت بڑا بوجھ اپنے دو بازوؤں سے اٹھا کر دونوں ٹانگوں پر لے آتا ہے بس ایک دفعہ ٹانگیں اٹھ کھڑی ہوں تو تمام وزن قابو میں آ جاتا ہے۔ چاہے پشت پر کتنا ہی بوجھ کیوں نہ ہو۔

کبھی کبھی وانگ خفگی میں آکر کہتا تھا۔

”اپنے آپ کو کیوں قتل کر رہے ہو۔ اپنی جان پر اتنا ظلم مت کرو۔ اب تو خون تک تھوکنے لگے ہو۔ یہ زندگی کا خاتمہ ہے“

باہر کی تاریخ اور واقعات ہمارے اندر کے روز مرہ سے بہت تیز اور بھرپور جارہے تھے۔ ایک روز جب میں نے رسیوں کو تسلی بخش طور سے باندھ لیا اور بوجھ اٹھانے ہی لگا تو وانگ میری مدد کو آ پہنچا۔ مجھے سہارا دینے کی بجائے وہ میرے پیچھے

وہاں کے گھٹے پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ او جوان! او بد معاش! تم اس مشقتی کیمپ میں زیادہ اچھے حال میں ہو میں اس کی آواز سن کر حیران ہوا۔ اس کا انداز کچھ بدلا ہوا تھا۔ ”تم یہاں اپنے آپ کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہو۔ میں پرسوں شہر گیا تھا پتہ ہے سڑکوں پر کس کا جلوس نکالا گیا تھا۔ اس سارے صوبے کے پارٹی سکیڑیوں اور پارٹی چیئرمینوں کا“ ان کے سروں پر کفنڈ سے بنی ہوئی بڑی بڑی ٹوپیاں تھیں ان پر لکھا تھا۔ ”ہم سرمایہ داروں کے حاشیہ نشین اور ان کے پیروکار ہیں۔“ لوگ تھخیک کے رنگ میں ان کے لئے دفن کے بجائے ٹوٹے ہوئے برتن اور واش بین بجا رہے تھے اور گا رہے تھے۔ ”یہ سرمایہ داروں کے پیچھے گئے والے لوگ ہیں۔ سرمایہ داروں کے ساتھی اور دوست۔“ اب بتاؤ اس حال میں تم ان سے بہتر نہیں ہو۔ یہاں بے شک اپنی عزت بناؤ اور گھٹے اٹھاؤ یاد ہے میں وہ نمائش دیکھنے گیا ”ثقافتی انقلاب کی شاندار کامیابیاں اور فتوحات“ لوگ اب کہتے ہیں کہ وہ ان صوبائی حکام کا دھوکا اور فریب تھا۔

”سرخ گارڈز“ کہتے ہیں کہ یہ اندر سے سرمایہ داروں کے حاشیہ بردار تھے۔ اپنے جرائم پر اس نمائش سے پردہ ڈالنا چاہتے تھے اور یہ نمائش عوام سے ایک طرح کا مذاق تھا اور ایک شعبہ بازی تھی۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان سب لوگوں کا بھانڈا سب کے سامنے سربازار پھوڑا جائے۔ سب سی پہلے صوبائی سکریٹری اور چیئرمین کی باری آتی۔ اب تم ہی بتاؤ کوئی کیا سمجھے۔

اس کے بعد ایک لمبی قطار ان لوگوں کی تھی جو پارٹی تنظیم سے نکالے گئے تھے۔ سب کھاتے پیتے زمیندار، جرائم پیشہ لوگ، دائیں بازو والے رجعت پسند۔ ایک لمبا جلوس تھا ان لوگوں کا تم بھی شاید انہیں لوگوں میں شمار کئے جاتے ہو۔ ان سب لوگوں کو وہی کفنڈی توپن آمیز ہیٹ پہنائے گئے تھے۔ کچھ کی تو ٹکلوں پر بھی کالک وغیرہ مل دی گئی تھی اور ان کے چہرے تمسخر آمیز رنگوں سے بگاڑے گئے تھے ”تو جوان بس یوں سمجھ لو تم بچ گئے ہو۔ یوں لگتا ہے کہ تمہیں جس نے یہاں کیمپ میں بھیجا ہے وہ کوئی تمہارا ہی بتایا ہوا عہدے دار ہو گا“ اس طریقے سے اس نے تمہیں بچا لیا ہے۔ نہیں تو آج تمہارا حال بھی ان جلوس والوں کا سا ہوتا، وہ حرامی جس طرح

ذیل کئے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا اس جلوس سی وہ مرکز ہی فارغ ہوں گے اور موت میں ہی ان کی اصلاح چھپی بیٹھی ہے تمہارا بھی یہی حال ہوتا تھا“

وہاں کی بالیوں نے بار بار چہرے کر میرے چہرے کو چھلنی سا کر دیا تھا۔ وانگ کے سگریٹ کا دھواں میرے نتھنوں میں داخل ہو رہا تھا۔ عجیب بات ہے جب شدت سے سگریٹ کی طلب محسوس ہوتی ہے بس ذرا سا دھوئیں کا بہہکا بھی آپ کے نتھنوں سے اندر چلا جائے۔ تو آپ کی اس شدید خواہش کو سیراب کر جاتا ہے۔ اتنے سے مزے اور مہک سے میرے بدن کو بھی اس طرح سکون سا مل گیا۔ حالات جب اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہوں پھر ممکن تو ہے کہ ملک کے ساتھ میری جیسے فرد کی قسمت کی کیا بھی جلد پلٹ جائے اور رہائی کی کوئی صورت نکل آئے۔

پھر میں نے گھٹوں کا اکھٹا کیا اب ساتھ گھٹے کافی نہ تھے آج میں آٹھ اٹھانے پر تلا ہوا تھا۔ وانگ ششدر ہو کر چیخا۔ ”او بد معاش اپنے آپ کو کیوں مارنا چاہتا ہے۔ مت بھولو ابھی دو سال کی قید باقی ہے۔ قید پوری کرو گے یا پہلے ہی مرو گے؟“

کسی کی خواب و خیال میں تھا کہ عظیم ملک چین میں جیل خانہ یا مشقتی کیمپ کو ہی گوشہ عافیت اور جائے امن و امان قرار دیا جائے گا۔

اس وقت یہاں میں کھڑا محصوروں سے گھرا ہوا خاصی اذیت سے دو چار تھا۔ میں خواہ مخواہ اس انتظار میں تھا وہ مجھے کوئی خبر سنائے گا۔ لیکن اس دانشمند بزرگ کے چہرے سے کچھ بھی عیاں نہ ہوا سوائے سگریٹ کے دھوئیں کی ایک بل کھائی ہوئی لکیر کے۔ جیسے آپ دھوئیں دار خاموشی کا نام دے سکتے ہیں۔ اتنے میں نزدیک ہی ایک بیج بونے والا ٹریکٹر یک دم حرکت میں آکر شور کرنے لگا۔ تمام دن دھوپ میں کھڑے رہنے کے بعد جب وہ شارٹ کیا گیا تو اس کے بدبو دار تیل اور دوسرے مرکبات کے ملے جلے دھوئے اور گیہوں نے کھیتوں کی صاف فضا میں خاص آلودگی پھیلا دی، مبعیت خاصی خراب ہوئی۔ یونہی لگا کہ اس زرعی زمین کو یہ میکائی آلات اور جدید صنعت راس نہیں آ رہے، ان کی بو باس سے یہ دھرتی تنہا سی نظر آتی تھی۔

اس آلودہ ہوا اور گیس کی وجہ سے میری مبعیت بھی متلائے لگی۔ میں نے

پوچھا۔ ”گینگ لیڈر وانگ میرے لئے کیا حکم ہے؟“۔ وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہوا۔ اسے میرے موجود ہونے کا احساس ہوا۔ ”نہیں اور تو کچھ نہیں“۔ اپنی جیب کی تلاشی لیتے ہوئے اس نے ایک مسلا ہوا سگریٹ نکالا جو آدھا پیا ہوا تھا۔ اور کچھ کچھ گیلا بھی تھا وہ سگریٹ مجھے دیتے ہوئے کہا ”واپس جاؤ“ ”واپس جاؤ“ کا مطلب تھا اس مشقتی کیمپ میں واپسی۔ میں نے اس کا دیا ہوا سگریٹ دیکھا تو اسکا منہ والا کنارہ ابھی گیلا تھا میں نے اس کو مڑوڑ کر کاٹا ہا تو سارا تمباکو بکھر گیا اور سگریٹ کا ستیا ناں ہو گیا۔ بیڑا غرق سگریٹ کے معاملے میں یہ تو مجھ سے بھی گیا گزرا نکلا لیکن اس سی کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے پاس اپنے سگریٹ تھے۔ اب ہماری ٹولے کو باقاعدہ ماہانہ جیب خرچ ملتا تھا اور ساتھ کچھ سگریٹ وغیرہ بھی۔ 1960 سی اب دنیا یہاں خاصی بدل گئی تھی۔ میں نے الیونیم کی اپنی ڈھیا نکالی جو مجھے میڈیکل فوجی یونٹ کے پاس کوڑے کے ڈھیر سے ملی تھی۔ میں نے اس ڈبی میں اس کا بچا کچھا تمباکو ڈالا اور پھر اپنا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ ہاں تو ”واپس جاؤں“۔

اس کی لمبی خاموشی میں ایک طرح سے نہ ختم ہونے والی فصاحت تھی۔ باہر جو افراتفری کا طوفان برپا تھا وہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کی خاموشی نے موجودہ صورت حال کی سنگینی پر گویا تصدیق کی حتیٰ مر لگا دی۔ اس بات کا مجھے بھی اندازہ تھا۔ اور میں بھی یہ بات سمجھ سکتا تھا۔ اس طرح کے مشقتی کیمپوں میں ہم میں سے ہر کوئی ایک طرح سی ہینگل کے فلسفے کا قائل تھا۔ اگر کچھ بھی نہ ہو تو ہم اس ”کچھ بھی نہ“ سے ”کچھ نہ کچھ“ ضرور نکال لیتے تھے۔ اس کائنات میں خالص خلا کہیں بھی نہیں جس کو آپ وقت یا مکان کے بغیر کہیں بھی پاسکیں۔ آپ کو جو خالی فضا میں یا خلا بظاہر نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی امید کے بہت حوصلہ افزا پہلو اور امکان مضمر ہوتے ہیں۔ قیدیوں کے لئے مید و نیم کا امکان !

دھان کے کھیتوں کی طرف میری تبدیلی سی عین ممکن ہے کہ میں ”اسے“ دیکھ

پاؤں۔

2

جیل خانے جب سے ایچلو ہوئے ہیں سب سے زیادہ چالاکی کی چال جو کسی نے سوچی ہے وہ یہی ہے کہ قیدیوں کو قیدیوں کی نگرانی اور حفاظت کے لئے استعمال کیا جائے۔ وہ بارہ قیدی جن کی دیکھ بھال مجھے کرنا تھی وہ مختلف پلانٹوں سے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ وہ اتنے مشکل لوگ نہیں تھے جتنا کہ وانگ ان کو سمجھتا تھا۔ اس کے ذہن میں ان قیدیوں کی درجہ بندی پارٹی کے کارڈ کے حوالے سے تھی، اور اسی لئے وہ مجھے بھی ان سی خاصا مختلف سمجھتا تھا۔

ہمارے دستے میں جلد ہی باہمی یگانگت اور بھائی چارے کا احساس پیدا ہو چکا تھا حالانکہ ہم بڑی بریگیڈ سی موجودہ صورت میں علیحدہ کر دیئے گئے تھے اور یہ بریگیڈ ہم سے کئی میل دور تھی۔ چاولوں کھیتوں سے خاصی دور ہماری اس چھوٹی سے ٹکڑی نے پہاڑی کی ایک چوٹی پر کچی اینٹوں سے بنے ہوئے چھوٹے سے گھر پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس اونچائی سے بے شک ہم نمر کے پار اس بریگیڈ کو بھی براہمن دیکھ سکتے تھے۔ جس کا ہم ایک حصہ تھے اور وہی ہماری اصل آماجگاہ تھی۔

ہمارے ارد گرد نہ کوئی بجلی کے تاروں کی باڑ لگائی گئی تھی، اور نہ ہی کوئی نگرانی کے لئے مینار تھا۔ اور نہ ہی ہمارے لئے کوئی بندوق نانے گاڑ کھڑا رہتا تھا۔ ارد گرد کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اور پرندوں کی چمچاہٹ سے ہمیں اس جگہ کچھ اپنے گھر کا سا احساس ہوتا تھا۔ جب نمر کے اپنی طرف والے کنارے پر ادھر ادھر پھول کھلتے تو شمد کی کھیاں دوسرے کنارے سے نمر عبور کر کے باہمی رابطے کا کام دیتیں اور گھوں گھوں کرتی ایسے آتی جاسیں جیسے انہوں نے انسانوں کے درمیان کھڑی دیوار یا رکھٹو یکسر پامال کر دی ہو۔ ان ”آزاد قیدیوں“ کی صورت میں بنا ہوا ہمارا گروپ کچھ اس قسم کا تھا کہ اس میں کچھ تو تھوڑی قید کاٹنے والے تھے، باقی وہ لوگ تھے جو اپنی اپنی طویل سزا کا باقی ماندہ حصہ کٹ رہے تھے۔ ان کا اب چھپ چھپا کر بھاگ جانا بالکل بے معنی اور بے کار تھا۔ خصوصاً ان حالات میں جن سے اب چین گزر رہا تھا اس